R.No. 2186/57 — Regd. No. L922.

انجمن ترقی اُردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

تاریخ اشاعت
۱-۸-۱۵-۲۲

ٹیلی فون ۹-
قیمت تین پیسے سالانہ
نئی پچاس نئے پیسے

جلد ۲۲۔ شمارہ ۴۷ | ایڈیٹر۔ آل احمد سرور | ۱۵ دسمبر ۱۹۶۳ء

آل احمد سرور

یادیں (پانیکر میموریل)

سردار کے۔ ایم۔ پانیکر کو ایک پروفیسر، ایک مورخ، ایک مدبّر اور ایک مقرر کی حیثیت سے تو سبھی جانتے تھے، مگر کم لوگوں کو یہ معلوم تھا کہ وہ سنسکرت کے ایک فاضل اور ملیالم کے ایک ممتاز ادیب بھی تھے۔ پانیکر بہت غیر معمولی آدمی تھے۔ اُن کی جو آن بان زندگی میں تھی وہ موت میں بھی قائم رہی۔ ابھی چکرورتی کے ایک لیکچر میں صدارت کر رہے تھے کہ انھیں دل میں تکلیف محسوس ہوئی اور ہسپتال پہنچتے پہنچتے ختم ہو گئے۔

پانیکر نے اپنی عملی زندگی کا آغاز علی گڑھ سے کیا۔ یہاں وہ کالج کے پروفیسر تھے اور پروفیسر حلیم کا بہت مذاق اُڑاتے تھے۔ اُنھیں بیچارہ حلیم کہہ کر یاد کرتے۔ اُس کے بعد کچھ عرصے وہ دوسری یونیورسٹیوں میں رہے اور پھر چیمبر آف پرنسز کے سکریٹری اور پھر بیکانیر کے دیوان ہوئے۔ آزادی کے بعد وہ چین اور مصر کے سفیر بھی رہے۔ ۱۹۵۵ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے انھیں اعزازی ڈگری دی۔ اُس موقع پر کانووکیشن کا خطبہ سمپورنانند نے پڑھا تھا۔ وہ ہوائی جہاز کے دیر میں آنے کی وجہ سے ذرا سی تاخیر سے آئے تھے۔ پانیکر خاموش بیٹھنے والے آدمی نہ تھے، برابر سمپورنانند جی پر فقرے کستے رہے۔ اُن کے اعزاز میں [illegible] کاری کا تھا۔ اس پر بہت جزبز تھے۔ اُنھوں نے ریاستی تنظیم کمیشن کے ممبر کی حیثیت سے اُتر پردیش کی تقسیم کی حمایت کی تھی اور اس پر ایک نہایت مدلل نوٹ لکھا تھا۔ اگر پنت جی اس وقت مخالفت نہ کرتے تو شاید تقسیم کی یہ تجویز خاصی زور پکڑتی۔ اُنھوں نے جدید ہندوستانی دور کے متعلق کئی ایسی کتابیں لکھیں جو بین الاقوامی شہرت رکھتی ہیں۔ وہ ہر مسئلے میں اپنی آزاد رائے رکھتے تھے اور کسی سے مرعوب ہونا جانتے ہی نہ تھے۔

ٹیگور کی یاد میں جو بین الاقوامی سیمینار ہوا تھا، اُس میں وہ نظر نہ آئے۔ ویسے ساہتیہ اکاڈمی کے ہر جلسے میں آتے تھے۔ گزشتہ فروری میں جب جموں میں ایک انٹرویو کے سلسلے میں اُن سے ملاقات ہوئی تو میں نے غیر حاضری کا سبب پوچھا۔ کہنے لگے میں ٹیگور کو کچھ ایسا قابل نہیں اور رنگ میں بھنگ ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔ چین کے ہماری سرحد پر حملے سے پہلے قومی یکجہتی کا بہت زور تھا۔ اُس پر ساہتیہ اکاڈمی نے ایک سیمینار کیا۔ دنکر جی نے ایک جذباتی تقریر کی اور ادیبوں کو مشورہ دیا کہ وہ ہندوستان کی تاریخ، اُس کی تہذیب کی وحدت اور قومی یکجہتی پر سب کام چھوڑ کر رسالے لکھیں۔ اُن کے بعد پانیکر کھڑے ہوئے اور بڑے مزے کی تقریر کی۔ فرمانے لگے کہ میں اتحاد کا قائل ہوں اور ہمیں اتحاد کی کوشش کرنی چاہیے، مگر یکجہتی کا تصور غلط ہے کیونکہ یہاں بہت سے تہذیبی دھارے ہیں اور سب کو فروغ ہونا چاہیے۔ اُس کے بعد اُنھوں نے کہا کہ مصنف تو (Non-Confirmist) ہوتا ہے۔ میں اسے حکومت کا بندہ دیکھنا نہیں چاہتا۔ اُسے صرف اپنے فن کا بندہ ہونا چاہیے۔ پانیکر نے جان بوجھ کر یہ بات کہی تھی۔

اس اشاعت میں

وہ چاہتے تھے کہ ادیب ادب کا دامن کسی حال میں نہ چھوڑیں۔

وہ دو سال سے قریب کشمیر یونی ورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔ وہاں اُن کا انداز یہ تھا کہ ذاکر صاحب گئے تو طلبہ سے بات کرنے لگے۔ ان کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی، یہ ایک پیڑ کے نیچے کھڑے ہو کر کتاب پڑھنے لگے۔ گزشتہ فروری میں ایک انٹرویو کے سلسلے میں اُن سے جموں میں ملاقات ہوئی۔ میں نے علی گڑھ میں توسیعی لیکچر کی دعوت دی۔ کہنے لگے لیکچر تو میں دوں گا، مگر ایک لیکچر سے کام نہیں چلے گا۔ کم سے کم تین لیکچر ہوں اور یونیورسٹی معقول آنریریم دے۔ میں نے کہا آپ کی شرط منظور ہے، آیئے تو سہی۔ مگر پھر وہ میسور چلے گئے اور موت نے بھی کب ان کے دروازے پر دستک دی، جب وہ ایک جلسے کی صدارت کر رہے تھے افسوس ہندوستان کا ایک ممتاز دانش ور، مورخ، ادیب اور عالم اُٹھ گیا۔

لوئی میک نیس جس کا حال میں انتقال ہوا۔ انگریزی کا ایک ممتاز شاعر تھا۔ اس صدی کی تیسری دہائی میں جب آڈن، اسپینڈر، سی ڈے لیوس کے ساتھ اس کا نام بھی لیا جانے لگا تھا۔ وہ آئرش تھا۔ شاعری کے علاوہ اُس نے آڈن کے ساتھ مل کر آئس لینڈ کے متعلق ایک کتاب لکھی اور بی۔ بی۔ سی کے ایک کارکن کی حیثیت سے گوئٹے کے فاؤسٹ کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ آڈن نے اپنے ایک مضمون میں اس ترجمے کو بہت سراہا ہے۔ اس کے تنقیدی مضامین کا ایک مجموعہ بھی شائع ہوا تھا۔ اُس زمانے میں یہ سب شاعر بائیں بازو کے سمجھے جاتے تھے، مگر میک نیس جو ایک دوسرے آئرش شاعر ڈبلیو۔ بی۔ ایٹس کا بڑا مداح تھا کچھ ایسا بیماری نہ تھا۔ اُس کی شاعری میں اپنے دور کے مسائل کی ترجمانی فن کارانہ طور پر ملتی ہے۔

آزادی کے کچھ دن بعد لکھنؤ میں ہم لوگوں کو معلوم ہوا کہ میک نیس آیا ہوا ہے۔ مسعود حسن رضوی (؟) نے جو شعبۂ انگریزی کے صدر تھے میک نیس کو چائے پر بلایا۔ اس مجمع میں ڈی۔ پی۔ مکر جی مرحوم، رادھا کمل مکرجی، ڈاکٹر علیم اور شعبۂ انگریزی کے کئی اُستاد بھی تھے۔ اُس نے ہم لوگوں سے بڑی بے تکلفی سے گفتگو کی۔ آڈن اور ایشروڈ کا مذاق بھی اڑایا کہ یہ لوگ انگلستان چھوڑ کر امریکہ چلے گئے۔ اُس زمانے میں مسز نائیڈو گورنر تھیں۔ دوسرے دن گورنمنٹ ہاؤس میں میک نیس کے اعزاز میں ایک جلسہ ہوا۔ شروع میں اُس نے جدید انگریزی شاعری کی خصوصیات پر ایک مختصر تقریر کی۔ تقریر میں کوئی خاص بات ایسی نہ تھی جو ہم لوگوں کو پہلے سے نہ معلوم ہو، مگر اس کے بعد جب اُس نے اپنا کلام سُنایا تو ہم لوگ ایک دوسری دنیا میں پہنچ گئے۔ اُس کے پڑھنے کا انداز، اس کا خلوص، پڑھتے وقت اُس کی آنکھوں اور اُس کے رخساروں کی چمک۔ سب نے ہم کو مسحور کر لیا۔ ایک نظم کا عنوان تھا "میں ابھی پیدا نہیں ہوا ہوں"۔ ہمارے یہاں ترنم کی لت کی وجہ سے شعریت جس طرح مجروح ہوتی ہے، اُس کے مقابلے میں یہ انداز نیا مسحور کن اور ساحرانہ تھا۔ مسز نائیڈو جیسی خاتون ہندوستان کو شاید اب نصیب نہ ہو۔ لیکچر اور شاعری کے بعد میک نیس کا ہاتھ پکڑا اور ایک طرف مجاز کھڑے ہوئے تھے، انھیں پاس بلایا اور کہنے لگیں۔ ہم نے تمہارا کلام سُنا، اب ہمارے شاعر کا کلام سُنو۔ میک نیس اُردو شعر کیا سمجھتا، مگر مجاز کی مقبولیت و محبوبیت کا کچھ اندازہ تو اُسے ہو ہی گیا ہوگا۔

اُردو افسانہ نگاری کا انعامی مقابلہ

انجمن تشہیر الادب شام پور (بھوپال) نے اُردو افسانہ نگاری پر انعامی مقابلے کا انتظام کیا ہے۔

پہلا انعام	اقبال میڈل	اور سو روپے نقد
دوسرا انعام	سرسید میڈل	اور چالیس روپے نقد
تیسرا انعام	پریم چند میڈل	اور بیس روپے نقد
چوتھا انعام	مولانا آزاد میڈل	اور تین انعامی کتابیں
پانچواں انعام	کرشن چندر میڈل	اور دو انعامی کتابیں

افسانے اور فیس داخلے کے پہنچنے کی آخری تاریخ ۲۱ر جنوری ۶۴ء ہے شرائط منگانے کے لئے ذیل کے پتہ پر رجوع کیا جائے

پتہ۔ ایم۔ اے۔ راہی، سکریٹری انجمن تشہیر الادب، اعجاز منزل مین اسٹریٹ۔ شام پور (بھوپال) ایم۔ پی

اُردو افسانہ نویسی کا مقابلہ

اُردو زبان کی خدمت کے لئے کارخانہ احمد حسین دلدار حسین پرائیویٹ لیمیٹڈ تاجر تمباکو خوردنی نے اپنا ایک الگ شعبہ خدمت ادب کے نام سے بنایا ہے جس کے تحت پہلا کام اُردو افسانوں کا کل ہند مقابلہ کیا جا رہا ہے جس میں پہلا انعام تین سو، دوسرا انعام دو سو اور تیسرا انعام سو روپے کا ہوگا۔ اس سلسلے میں مزید معلومات کرنے کے لئے "خدمت ادب" معرفت احمد حسین دلدار حسین پرائیویٹ لیمیٹڈ، چوک لکھنؤ سے رجوع کیا جائے۔

سنسکرت بھون کی دہلی شاخ

علاقائی ادب کو ترقی دینے والے بھارتیہ سنسکرت بھون نے دہلی میں جنوری کے مہینے ایک شاخ کھولنے کا فیصلہ کیا ہے۔

بھون کے جنرل سکریٹری مسٹر نبوی سرکار نے کہا ہے کہ دہلی شاخ ہندوستانی ثقافت کے مختلف پہلوؤں پر بحث و مباحثہ اور تقریروں کا انتظام کرے گی اور گجراتی، تامل، ہندی، بنگالی اور اُردو کی تعلیم کے لئے درجے بھی کھولے گی۔

رئیس مینائی

جامع الاخبار

جنوبی ہند کا پہلا اُردو اخبار

ہیچ گر ذوقِ طلب از جستجو باز م نہ داشت
دانہ می چیدم دراں روزے کہ خرمن داشتم

قدیم سرمایہ کی تلاش و جستجو، چھان بین اور تحقیقات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اُردو کا پہلا[1] اخبار ماسٹر رام چندر داس نے "خیر خواہ ہند" کے نام سے نکالا تھا، لیکن جنوبی ہند میں اُردو کا پہلا اخبار کب نکلا اور کس نے جاری کیا تھا اس کی تحقیق نہ ہو سکی اور اس باب میں مختلف حضرات کی مختلف رائیں ہیں، گارساں دتاسی نے "عمدۃ الاخبار" کو مدراس کا پہلا اُردو اخبار بتاتے ہوئے اس امر کی بھی وضاحت کر دی ہے کہ یہ اخبار بہت پہلے بریلی سے نکلتا تھا" اور مولوی نصیر الدین ہاشمی نے "عمدۃ الاخبار" کو جنوبی ہند کا پہلا اردو اخبار تسلیم کیا ہے اور بغیر کسی ثبوت اور دعوے کے مذکورالصدر اخبار کو والاجاہ محمد علی خاں ناظم آرکاٹ کے دوسرے لڑکے عمدۃ الامراء (متوفی ۱۲۱۶ھ مطابق ۱۸۰۱ء) کے نام نامی سے مشابہت رکھنے کی بناء پر یہ قیاس فرمایا ہے "شاید عمدۃ الاخبار عمدۃ الامراء کے عہد حکومت میں جاری ہوا" اور افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق کرنولی نے "اعظم الاخبار"[2] کو جنوبی ہند کا پہلا اردو اخبار تسلیم کیا ہے۔

میں مسلم لائبریری بنگلور میں بعض پرانے رسائل کا جائزہ لے رہا تھا: "جامع الاخبار" کا ایک قدیم مجلد میرے ہاتھ لگا جسکو مولوی عبدالرحمٰن نیفتی مالک فیض عام پریس نے ۱۹۳۲ء میں بطور عطیہ لائبریری کو عنایت کیا تھا۔ لائبریری میں چونکہ اس اخبار کی صرف تیسری جلد (جنوری ۱۸۴۳ء تا غایت دسمبر ۱۸۴۳ء) موجود ہے اس لئے یہ بتانا مشکل ہے کہ اس کا سن اجراء کیا تھا" ظن غالب تو یہی ہے کہ ۱۸۴۱ء میں یہ اخبار نکلا ہو گا" "جامع الاخبار" سید رحمت اللہ کی ادارت میں ہفتہ میں صرف ایک مرتبہ پیر کے دن بہرام جنگ باغ مونٹ روڈ مدراس سے شایع ہوتا تھا، کلاں سائز کے آٹھ صفحات پر مشتمل تھا جس کے ہر صفحہ پر دو کالم ہوتے تھے۔ کتابت و طباعت اس دور کے لحاظ سے بڑی معیاری اور کاغذ سفید استعمال کرتے تھے، دورِ حاضر کے دوسرے اخبارات کی طرح یہ اخبار بھی خالص سیاسی انداز کا تھا جس میں اندرون ہند و بیرون ہند کے احوال و کوائف شایع ہوتے تھے۔ اس اخبار کا پہلا صفحہ سرکار ہند کے احکامات و ہدایات اور فوج کی نقل و حرکت کے لئے مخصوص تھا، دوسرے صفحات پر مقامی خبریں اور ہندوستان کے مختلف مقامات اور دیار و امصار کی تازہ خبریں شایع ہوتی تھیں، اور تازہ خبروں کی جلد سے جلد فراہمی کے لئے بڑا معقول انتظام و اہتمام کیا گیا تھا اس اخبار کی ایک نمایاں خوبی اور خصوصیت یہ تھی کہ انگریزی خبروں کا ترجمہ بھی بڑی خوبی سے کیا جاتا تھا، بیرونِ ہند کی خبروں میں اسلامی ممالک کی خبریں کثرت سے چھاپی جاتی تھیں، اور دنیا کے بعض مقامات کے مختلف جغرافیائی، تاریخی، معاشرتی اور معاشی حالات بھی درج ہوتے تھے، اس قدیم اخبار میں اس دور کے بعض شعرا کی غزلیں اور قطعات وغیرہ بھی مل جاتے ہیں، اُردو اخبارات کی آمدنی کا ایک مستقل ذریعہ اشتہارات ہوتے ہیں لیکن "جامع الاخبار" میں کبھی کبھی کچھ کتابوں کے اشتہارات کے سوا کسی قسم کا کاروباری اشتہار نہیں چھپتا تھا، اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ خریداروں کی آمدنی سے اخبار کے سارے اخراجات و مصارف نکلتے تھے جو ہندوستان کے مختلف گوشوں اور حصّوں میں پھیلے ہوئے تھے۔

اب میں قارئین کی ضیافتِ طبع کے لئے بغیر کسی اہتمام اور رد و کد کے "جامع الاخبار" کے چند اقتباسات درج کرتا ہوں، جس سے اس دور کے حالات و واقعات کا اندازہ ہو سکے گا، اور زبانِ اُردو جن مراحل اور عبوری دور سے گزر رہی تھی اس سے واقفیت ہو سکے گی۔

خبر میرٹھ

لفٹن گورنر آگرے کے میرٹھ کو آکر پہنچے اور سلوٹ کے توپاں ان کے واسطے چھوٹے۔ طبیعت ان کی بہت ناخوش ہے۔ کسی لوگ سے ملاقات نہیں کرتے ہیں، کیونکہ طبیب ان کے کہتے ہیں کہ ذرہ بھی حرکت کرنا لفٹن گورنر صاحب کے حق میں مُضر ہے۔

(جنوری ۱۸۴۳ء)

خبر مدراس (راز نگارڈ)

مخبر اس کا لکھا ہے کہ نواب کرناٹک کچھ دین عیسیٰ کی طرف مائل ہیں، یہ تو چنداں لائق اعتبار نہیں گو کہ زبان زد عام ایسا ہووے پر بندگان عالی کے اوضاع اور اطوار کے نظر کرتے ہوئے ایسی کچھ صورت نہیں پائے جاتی۔

(فروری ۱۸۴۳ء)

---

[1] محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر نے ۱۸۳۶ء میں دہلی سے اُردو اخبار جاری کیا۔ ۱۸۳۷ء میں "سید الاخبار" نکلا اور ۱۸۴۳ء میں "مظہر الحق" نامی اخبار شائع ہونے لگا۔

[2] رسالۂ اُردو بابت ماہ اپریل ۱۹۳۱ء۔

خبر روس

وہاں کے اخبار سے پایا جاتا ہے کہ روس کے تجار کا مال چین کے سرحد میں بہت کم فنا ہے کیونکہ ولایت انگلستان کے طرف سے ڈبلس ایسا وولاتی اسباب ارزاں چین میں پھیلا ہے کہ روس کے اشیاء سے استغنائے کمال ہو گیا ہے۔

(مارچ ۱۸۴۴ء)

"کلام لطیف آرکاٹی"

مارچ ۱۸۴۴ء کے پرچے میں اسعد الاخبار دکن سید قطب الدین لطیف آرکاٹی کی ایک غزل جو بہادر ظفر شاہ کے، اس مصرع کے جواب میں لکھی گئی ہے ایڈیٹر کے حواشی کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ ع:-

قلم تراش سے مت استخواں تراش کے پھینک

لطیف مترزہ پور ضلع بنگلور کے رہنے والے تھے، چونکہ زمانۂ دراز تک آرکاٹ میں مقیم رہے اس لئے لطیف آرکاٹی کے نام سے مشہور ہوئے، لطیف نے اپنے کلام میں نہایت سلیقہ اور چابکدستی سے شاعرانہ لطافت کے ساتھ نقش حیات کی مصوری و عکاسی کی ہے۔ سلاست، روانی، پرکیف اور مترنم انداز بیان ان کے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں، لطیف آرکاٹی کا دیوان ۱۲۹۹ھ میں شائع ہو چکا ہے، قارئین کے ملاحظہ کے لئے لطیف آرکاٹی کی پوری غزل نقل کی جاتی ہے جو میسور کی اردو نوازی کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔

"جواب میں مصرعہ شاہ دہلی کے سید قطب الدین لطیف مدراسی نے آٹھ مصرعہ رنگین کہ ہر مصرع سرگلا بوت حدیقۂ ثانیہ ہے واسطے نظارہ گلزار معانی کے بیچ جلوہ ظہور کے لائے، قاصرا فان جوہر سخن اس کلام دل لطیف کو پرکیں:"

"قلم تراش سے مت استخواں تراش کے پھینک"

رواں نہ ہو تو قلم کی زباں تراش کے پھینک\
اگر بہار کی رکھتا ہے آرزو دل میں\
تو گل کے واسطے شاخ خزاں تراش کے پھینک\
یہ تیر عشق نہ پہنچے اگر نشانے تک\
تو توڑ تاڑ کے تیر و کماں تراش کے پھینک\
تجھے قسم ہے مرے عشق کی ارے آذر\
تو مت صنم کے مقابل بتاں تراش کے پھینک\
لکھا لطیف کو شاہ ظفر یہی مصرع\
قلم تراش سے مت استخواں تراش کے پھینک

(مارچ ۱۹۴۴ء)

خبر آسٹریلیا

اس مقام میں اقصائے جہاں سے ولایتیاں اور حبشیاں آکے جمع ہوئے ہیں، اور ہوتے ہیں، وسعت اس جزیرے کی کچھ کم و زیادہ چین کے جزیرے کے برابر ہے تین کروڑ اور تین لاکھ باشندے وہاں رہتے ہیں، اور چھ کروڑ گائے اس ملک میں ہیں۔ ایک کروڑ ستر لاکھ کانی کی زراعت وہاں ہوتی ہے۔ (اپریل ۱۸۴۴ء)

خبر کلکتہ

جنرل کیسمنٹ بہادر جو شوریٰ کلکتے کے رکن تھے دنیا سے رخصت ہوئے، انھوں نے مرنے کے ایک روز آگے وصیت نامے لکھے جو از روئے انگریزی وہ معیوب ہے اس سبب سے ورثہ بہادر مذکور کے اس وصیت نامے کو اٹھا دینے کے واسطے عدالت کے طرف رجوع ہونے پہ ہیں۔ (مئی ۱۸۴۴ء)

خبر لکھنؤ

لکھنؤ کا حال الآن کمان کان ہاتھ میں اوباشوں کے ہے۔ شمشیر و سنان اور رعیت پریشان عاملوں کا جور ہے خارج از بیان اور شاہ عادل زمان مشغول بایوان اور وزیر اعظم احمد علی خاں تاسف سے دست مالان اور ایک خلق کثیر کو شکایت بزبان، رسیڈنٹ بہادر مہر سکوت رکھے ہیں بر دہان، (جون ۱۸۴۴ء)

خبر میسور

اس تاریخ میں وہاں کے راجہ صاحب کا سالگرہ ہونے کے سبب سے یکا دن توپ عمر کے تبج کا وقت قلعہ پر چھوٹے اور بڑا جشن ہوا۔ برسات اچھا ہونے کے سبب سے وبا کی تخفیف پائی جاتی ہے۔ لیکن فقط دو تین آدمی سرحد میں میسور کے کبھی کبھی مرتے جاتے ہیں۔ (جولائی ۱۸۴۴ء)

خبر دہلی

وہاں کے اخبار سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مہینے کے چاردویں تاریخ کو دہلی میں ایک زلزلہ ہوا اور بعد ایک بڑی ٹکڑی ٹلی کی وہاں سے گزری، برسات ابھی تک وہاں نہیں شروع ہوا ہے۔ نواب مرزا علی کی تقصیر صدر عدالت کے سرداؤں کے بارے میں ثابت ہوئی، چنانچہ علانیہ نواب مذکور کو سشن جج کے فیصلے کے مطابق سزا پہنچی۔ (اگست ۱۸۴۴ء)

(باقی صفحہ ۸ پر)

غزلیں

شاد عارفی

وفاؤں کا اُن پر اثر کیا ہوا! بہت آسرا تھا۔ مگر کیا ہوا!!؟
ہجوم سبزہ رہ گذر کیا ہوا وہ ہنگامۂ سنگ و در" کیا ہوا
وہ انداز تیغ نظر اب نہیں تغیّر کا باعث مگر کیا ہوا؟
گیا ہے کوئی "رہزنوں کی طرف" تو کیا سوچنا؟ راہبر کیا ہوا؟
سنورتے نہیں کاکلِ شامِ غم نظامِ طلوعِ سحر۔ کیا ہوا؟
"یقیں آگیا چغلیوں پر انھیں" وہ سررشتۂ معتبر کیا ہوا
"نگاہیں بچا کر جو پہنچا وہاں" ... تو پھر... ہاں تو پھر... نامہ بر کیا ہوا؟
وہ "سرو خراماں" اگر شعر ہے تو اس شعر کا۔ مختصر کیا ہوا
ترے حق میں تیرے عدو کے طفیل خبر بھی ہے اے بے خبر۔ کیا ہوا؟
"ہے بد گوہر" بھی ہے ... تو کیا کھٹکتا رہا۔ رات بھر۔ کیا ہوا

رہی نا موافق زمینِ وطن
فضا کا اثر۔ شاد پر کیا ہوا

احسن جعفری

فروغِ خندۂ گل ہے نہ گریۂ شبنم بجھا بجھا سا ہے اب کے بہار کا موسم
گلِ نگاہ پہ بکھرے ہیں کس نے کہ آج دیارِ دل نظر آنے لگا ہے شکلِ ارم
کہیں خلوص و یقیں کی کرن بھی مل نہ سکی فریب کھائے ہیں اکثر بنامِ دیر و حرم
دمِ جدائی وہ رہ رہ کے یاد آتا ہے کسی کے لہجے کا دکھنا کسی کی آنکھ کا نم

یہ کس کے لطف کی پُروائی آج چلتی ہے
مہک رہا ہے سمن زارِ آرزو پیہم

محمد منظور احمد

زخم پر زخم مرے دل کو دئے جاتے ہیں رحم آتا ہے تو پھر خود ہی سئے جاتے ہیں
تیرے دیوانے بس اک تیری خوشی کی خاطر زیست کا زہر بہر حال پئے جاتے ہیں
وقت کی کتنی کڑی دھوپ سہے جاتے ہیں آفریں باد! کہ ہم لوگ جئے جاتے ہیں
جب بھی ہو جاتے ہیں روشن تری یادوں کے چراغ آتشِ غم کو مری تیز کئے جاتے ہیں
کس نے پھر تازہ کیا تذکرۂ جرم و سزا؟ پابجولاں یہ کسے لوگ لئے جاتے ہیں
جانے کیوں گونج سی ہر وقت سنا کرتا ہوں دور سے جیسے وہ آواز دئے جاتے ہیں

ہم سے نادان بھی کم ہونگے جہاں میں منظور
وا اُن کے وعدہ پہ پھر وسوسہ جوڑے گئے جاتے ہیں

نظام منظر

دلوں کی بات ہونٹوں پر کہاں ہے نظر ہی اب نظر کی رازداں ہے
زمانہ سازگار آئے نہ آئے محبت کامراں تھی کامراں ہے
تمہاری مست نظروں کے تصدق غمِ دوراں غمِ دوراں کہاں ہے
ہوس کی لذتیں بس عارضی ہیں محبت تو سرودِ جاوداں ہے

جمالِ دوست ہے اب روحِ منظر
اسی کے دم سے یہ جشنِ بہاں ہے

"ہندی کے ادیبوں کی طرف سے اُردو کے فسانہ نگار کا سواگت"

۲۲ر نومبر کی شام ۵ بجے "کیفے الکا" الٰہ آباد میں "نولیکا" اور "اُردو ساہتیہ" کی طرف سے اُردو کے نوجوان فسانہ نگار ڈاکٹر قاضی عبدالستار کے اعزاز میں ایک بہت بڑا جلسہ ہوا۔ پُر تکلف "عصرانہ" کے بعد ہندی کے مشہور نقاد و فسانہ نگار اور شاعر شری ناگ ارجن جی نے ڈاکٹر قاضی عبدالستار کا سواگت کیا اور اپنی تقریر میں یہ بھی کہا کہ پریم چند کے بعد جس فنکار نے ہندوستان کی دیہاتی زندگی کو انتہائی خوبصورتی گہرائی اور گیرائی کے ساتھ اپنے فن کا موضوع بنایا ہے اس کا نام قاضی عبدالستار ہے۔ قاضی عبدالستار وہ واحد فسانہ نگار ہیں جن کے کارناموں میں زندہ ہندوستان کے زندہ مسائل کی دھڑکن سُنائی دیتی ہے۔ سریندر پال جی نے اپنی تقریر میں قاضی عبدالستار کے ناولٹ "للی" کی تعریف و توصیف کی۔ پھر قاضی عبدالستار نے مختصر تقریر میں اُردو تنقید کی اس روش پر بھی افسوس کیا جو اُردو نثر سے سوتیلی ماں کا سلوک کرتی آئی ہے۔ آخر میں صدر جلسہ جناب اُپندر ناتھ اشک نے قاضی عبدالستار کا شکریہ ادا کیا' ان کی تخلیقات کو سراہا۔ اور تنقید کی بے حسی پر افسوس ظاہر کیا۔ جلسے میں بہت سے اہم لوگوں کے علاوہ جن چوٹی کے فنکاروں نے شرکت کی ان کے نام یہ ہیں۔

شری باچسپتی پاٹھک، شری اُپندر ناتھ اشک' شری ایلا چندر جوشی، شری ناگ ارجن، شری شری پت رائے' ڈاکٹر ہردیو رائے، شریمتی کوشلیا اشک، ڈاکٹر رگھو ونش' شری سریندر پال، شری لکشمی کانت ورما، ڈاکٹر رام سوروپ چترویدی، شری بلونت سنگھ، شری نریش مہتہ، شری مارکنڈے' شری امرکانت، شری کیشور پرشاد مسرا، شری ونود رستوگی' شری شری رام ورما، شری پرکاش رنجن، شری گھنشیام پنکج' اور شری اجیت پشکلم۔ (بلونت سنگھ سمپادک)

(اُردو ساہتیہ الٰہ آباد)

کالپی میں انجمن ترقی اُردو کی سرگرمیاں

بحوالہ قومی آواز۔ کالپی میں انجمن ترقی اُردو کے ایک جلسے میں اُردو کی بقا اور ترقی کے مسائل پر غور کیا گیا۔ اس سلسلے میں طے پایا کہ لکھنؤ میں ہونے والی ریاستی کانفرنس کو کامیاب بنانے کی کوشش کی جائے۔ آزاد لائبریری کالپی میں اُردو ادب کا نایاب ذخیرہ جمع کیا جائے۔ بچوں کو اُردو پڑھنے کے لئے راغب کیا جائے اور سرکاری اسکولوں میں اُردو رائج کرنے کی کوشش کی جائے۔

منظر سلیم

مجاز کی یاد

مجاز کی یاد سے لکھنؤ کی ایسی ادبی سرگرمیوں کی یادیں بھی وابستہ ہیں جو اب شاید ہی دیکھنے میں آئیں۔ ۱۹۴۷ء سے قبل اور بعد کے چند برسوں میں یہاں جس پیمانے پر جدید ادبی تحریک کو فروغ حاصل ہوا اور جیسے اچھے ادب کی تخلیق ہوئی اس کی مثال اس دور کے اردو کے کسی دوسرے ادبی مرکز پر شاید ہی مل سکے۔ اردو کا کوئی معیاری رسالہ یا منتخب تحریروں کا مجموعہ ایسا نہ ہوتا تھا جس میں اس وقت کے لکھنؤ کے متعدد لکھنے والوں کی تخلیقات شامل نہ ہوتی ہوں۔

ناقدوں میں ڈاکٹر علیم، آل احمد سرور اور سید احتشام حسین پیش پیش تھے، علیم صاحب ہمیشہ کی طرح اس زمانہ میں بھی بہت کم لکھتے تھے لیکن ادبی جلسوں میں تنقیدی مضامین، افسانوں اور نظموں پر ان کی جچی تلی رائے بڑی اہمیت رکھتی تھی اسکے برخلاف سرور صاحب اور احتشام صاحب کی تخلیقی سرگرمیاں پورے شباب پر تھیں، اور ایک لحاظ سے ان دونوں ناقدین کی شہرت اور مقبولیت میں اس دور میں لکھے ہوئے مضامین کا بہت ہاتھ ہے۔ انھیں دنوں اردو تنقید ایک نئے نام سے متعارف ہو رہی تھی، یہ تھے ڈاکٹر محمد حسن انھوں نے اس وقت تک بہت کم مضامین لکھے تھے لیکن جس محنت اور لگن کے ساتھ وہ ادب کے مطالعہ اور اچھے ادب کی تخلیق کی تیاریوں میں مصروف تھے وہ آگے چل کر ان کے اور اردو ادب کے بہت کام آئی۔ افسانہ نگاروں میں حیات اللہ انصاری سب سے الگ تھلگ "شکستہ کنگورے" کے افسانے لکھ رہے تھے، قرۃ العین حیدر کے افسانے اردو رسائل میں شائع ہونے لگے تھے اور انہوں نے اپنی گنتی کے افسانوں اور مخصوص انداز تحریر سے ادبی دنیا میں سنسنی پھیلادی تھی۔ یہی حال شوکت صدیقی کا تھا۔ انھوں نے بھی اس وقت تک بہت کم افسانے لکھے تھے۔ لیکن ڈاکٹر محمد حسن کی طرح وہ بھی خود کو آنے والے دنوں کی تخلیقی ذمہ داریوں کے لئے بڑی محنت کے ساتھ تیار کر رہے تھے، وہ کوئی افسانہ لکھنے سے دو تین ماہ قبل اس کے بارے میں دوستوں سے تبادلۂ خیال شروع کر دیتے تھے اور جب ایک ایک تفصیل ان کے ذہن میں واضح ہو جاتی تھی تو "تانیا" جیسا افسانہ لکھ دیتے تھے۔ شاعروں میں پنڈت آنند نرائن ملا، سراج لکھنوی، اثر لکھنوی جدید ادبی تحریک کے زیر اثر غزل کو نیا ساز و آہنگ دے رہے تھے خود مجاز کبھی کبھار کوئی نظم یا غزل اس معرکے کی لکھتے تھے کہ مہینوں اس کا چرچا رہتا تھا سلام مچھلی شہری کا یہ حال تھا کہ غالباً ہر روز ایک نظم لکھتے تھے اور نئے شاعروں میں راقم الحروف اور کمال احمد صدیقی کی نظمیں دہلی اور لاہور کے پرچوں اور سال کے سال شائع ہونے والے بہترین نظموں کے مجموعوں میں شامل ہونے لگی تھیں۔ اسی طرح اور بھی لوگ تھے جو ریڈیو ڈرامے افسانے اور نظمیں لکھ رہے تھے ان سب کی ذات سے پرانا کافی ہاؤس بڑا ادبی مرکز بن گیا تھا۔ شام کو ڈاکٹر علیم کے گرد لوگ اکٹھا ہونا شروع ہوتے، دو کرسیوں سے چار، چار سے چھ اور پھر بعض اوقات آٹھ دس کرسیاں تک ایک چھوٹی سی میز کے گرد اکٹھا ہو جاتیں اور نو بجے رات تک بحث مباحثہ، شعر و شاعری اور ہنسی مذاق کا سلسلہ جاری رہتا، پھر حضرت شیخ سے علیم صاحب اور سرور صاحب کے اپنے گھروں کو واپس لوٹ جانے کے بعد ادیبوں شاعروں کا قافلہ امین آباد کی طرف روانہ ہوتا اور یہاں رات گئے تک چائے خانوں میں محفلیں جمتیں اور نظموں اور افسانے کے خاکے مرتب ہوتے۔

ہفتہ بہفتہ ہونے والے ادبی جلسوں میں اردو کے اتنے مشہور لکھنے والے اکٹھا ہو جاتے تھے کہ ان پر چھوٹی موٹی کانفرنس کا گمان گزرتا تھا۔ ان میں ڈاکٹر علیم، آل احمد سرور، سید احتشام حسین، حیات اللہ انصاری، ڈاکٹر رشید جہاں، آنند نرائن ملا، اثر لکھنوی، رضیہ سجاد ظہیر، اسرار الحق مجاز، شوکت صدیقی، سلام مچھلی شہری، محمد حسن، مکین احسن کلیم، مسیح الحسن رضوی، کمال احمد صدیقی، ڈاکٹر احسن فاروقی اور متعدد دوسرے لکھنے والے بھی شامل ہوتے تھے اور بحث کچھ اس انداز کی ہوتی تھی کہ معلوم ہوتا تھا لاٹھی ڈنڈے کی نوبت آجائے گی۔

اس پورے گروہ میں علیم صاحب کو چھوڑ کر مجاز ہی ایک ایسے تھے جن کے لکھنے کی رفتار غالباً سب سے دھیمی تھی اور سال میں ایک دو نظم غزل کا اوسط پڑتا تھا۔ وہ اس دور میں قدم رکھ رہے تھے جس میں شراب ان کے لئے ہر شے سے زیادہ اہمیت اختیار کر گئی اور شراب حاصل کرنے کے لئے ظاہر ہے کہ انھیں خاصی جد وجہد کرنی پڑتی تھی کیونکہ مشاعرے یا ریڈیو پروگرام کے سوا ان کی آمدنی کا کوئی دوسرا ذریعہ نہ تھا۔ اس بھاگ دوڑ کے نتیجے میں انھیں کسی حد تک ذہنی الجھنوں کا بھی شکار ہونا پڑا تھا۔ چنانچہ اس وقت ان کے سامنے دو مسائل تھے ایک تو یہ کہ ان کے دوست احباب ان کے ارد گرد کا سارا ماحول ادبی طور پر تخلیقی سرگرمیوں میں مصروف تھا۔ لوگوں کی نظمیں، افسانے اور مضامین بڑی آب و تاب سے رسالوں میں چھپ کر آتی تھیں، رسالوں میں لکھنؤ کے ادیبوں شاعروں کی تصویریں شائع ہوتی تھیں، اور لوگ یہ رسالے لے کر کافی ہاؤس آتے اور ایک دوسرے کو دکھاتے تھے اور ایک طرح سے مقابلے کی فضا پیدا ہو گئی تھی۔ لیکن مجاز کا حال اس سے مختلف تھا وہ بہت کم لکھتے تھے اس لئے ان کی نظموں غزلوں یا تصویروں کے اتنی پابندی کے ساتھ رسائل میں شائع ہونے کا سوال ہی نہ اٹھتا تھا چنانچہ ایک طرف تو ایک حساس شاعر کا یہ احساس تھا کہ وہ تخلیقی اعتبار سے اپنے ہمعصروں کی ایسی سرگرمیوں سے محروم ہے، اور وہ جتنا اور جیسا لکھ رہا ہے اسے اس سے زیادہ اور اچھا لکھنا چاہئے (اور بعض اوقات وہ اپنی اس الجھن کا اظہار بھی کرتے تھے) دوسری طرف زندگی کی مادی الجھنیں اور دشواریاں تھیں۔ یہ الجھنیں کھانے کپڑے کی حد تک سہی لیکن

شراب کی ضرورت کے سلسلے میں بہر حال تھیں۔ ان حالات میں ان کے مزاج میں چڑچڑا پن پیدا ہو جاتا تو کوئی تعجب کی بات نہ ہوتی۔ لیکن اس سارے گردو میں وہ جیسے وسیع ظرف کے مالک تھے اس کو یاد کرکے آج حیرت ہوتی ہے۔ ادیبوں شاعروں میں ایک طرح کی مقابلے کی فضا پیدا ہو گئی تھی۔ لوگ آپس کی ساری دوستی کے باوجود ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لئے جوڑ توڑ بھی کرتے تھے۔ ایک دوسرے سے جلتے تھے، ایک دوسرے کے اچھے افسانے اور اچھی نظموں میں بھی جان بوجھ کر برائیاں تلاش کرتے تھے لیکن مجاز کا حال بالکل مختلف تھا۔ وہ کسی کی ترقی کو دیکھ کر نہ جلتے تھے نہ کسی کے خلاف کوئی جوڑ توڑ کرتے تھے۔ تمام لوگوں کی چیزیں بڑی توجہ اور انہماک سے سنتے اور تعریف کرتے تھے۔ ادبی معاملات ادبی جلسوں اور کانفرنسوں اور اس وقت کی ادبی سیاست (کمیونسٹ دوستی) کے سلسلے میں وہ بہت سنجیدہ تھے۔ اپنی تمام ذہنی الجھنوں کے باوجود وہ ادبی جلسوں میں شریک ہوتے تھے اور آخر تک موجود رہتے۔ بحث کرنے کی ان کی عادت نہ تھی اور بحث میں بہت کم حصہ لیتے تھے۔ لیکن جلسوں میں جو گرما گرم مباحثے ہوتے تھے ان سے انھیں کوفت بھی ہوتی تھی۔ اور بعض اوقات تو گھنٹوں کی لاحاصل بحث پر کوئی ایسا فقرہ چست کر دیتے کہ لوگ تڑپ کر رہ جاتے۔

مجاز اپنی نسل سے پہلے کے ادیبوں شاعروں کا بہت احترام کرتے تھے۔ کبھی جگر صاحب آکر بھوپال ہاؤس میں مقیم ہوتے تو وہ پابندی کے ساتھ ان سے جس طرح ملنے جاتے اور ان کے پاس جس عقیدت سے بیٹھتے وہ بس دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ اسی طرح وہ ملا صاحب، اثر صاحب، ڈاکٹر علیم، احتشام صاحب اور سرور صاحب وغیرہ کا بھی بہت احترام کرتے تھے۔ ان کا یہ رویہ اس دور میں خاص طور سے اہمیت رکھتا تھا کیونکہ وہ ادب پر کمیونسٹ انتہاپسندی کے غلبے کا زمانہ تھا۔ بات بات پر رجعت پسندی کا طعنہ دیا جاتا تھا۔ ادبی جلسوں میں یونی ورسٹی کے لڑکے اور کمیونسٹ پارٹی کے معمولی کارکن ان مشہور ادیبوں شاعروں سے یوں الجھ جاتے تھے جیسے کہ وہ اپنی عمر کے کسی بے تکلف دوست یا حریف سے جھگڑا کر رہے ہوں۔ اس دور میں بھی جب ملا صاحب، ڈاکٹر علیم سرور صاحب کافی ہاؤس میں داخل ہوتے تھے تو مجاز خواہ وہ اپنے مداحین کے جھرمٹ میں گھرے ہی کیوں نہ ہوں اٹھ کھڑے ہو جاتے تھے۔

جہاں تک اس زمانے کی نئی نسل کے لکھنے والوں کا تعلق ہے ان کا مجاز سے بڑھ کر کوئی اور ہمدرد اور دوست نہ تھا۔ ان کی ادبی سرگرمیوں کے متعلق وہ پوچھتے رہتے۔ ان کی چیزیں اصرار کرکے سنتے اور ان کا حوصلہ بڑھاتے۔ جو ان سے مشورہ کرتا اسے مشورہ دیتے جو ان سے قریب آتا اسے اور زیادہ قریب آنے کا موقع دیتے، اپنے ساتھ مشاعرے میں لے جاتے، لوگوں سے تعارف کراتے وقت تعریفی کلمات استعمال کرتے اور کبھی انھیں کہیں سے روپے ملتے تو اس بات کی کوشش کرتے کہ ان کے ہمعصر دوستوں کے ساتھ ساتھ نئی نسل کے وہ یہ چند لکھنے والے بھی جو ان سے زیادہ قریب تھے اس روپے سے حاصل ہونے والی تفریح میں شریک ہوں۔ انتہا یہ ہے کہ نشے کی حالت میں بھی وہ اس سلسلے میں غافل نہیں ہوتے تھے۔ ان دنوں بعض لوگوں کا یہ محبوب مشغلہ تھا کہ جن لکھنے والوں کو کافی ہاؤس کی میز پر اپنے طنز کا نشانہ نہیں بنا پاتے تھے ان سے نشے کی آڑ میں نپٹ لیں۔ لیکن مجاز ایسے موقعوں پر بھی جب انھیں اپنے تن بدن کا ہوش نہیں رہ جاتا تھا جانے کس طرح اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ ان کے رویہ سے کسی کا دل نہ دکھے۔ دل دکھانا تو شاید انھیں آتا ہی نہ تھا۔

پھر آزادی کے بعد جیسے جیسے زمانہ بدلا، لکھنؤ کے ادیبوں، شاعروں کی یہ محفل درہم برہم ہوتی گئی۔ کچھ لوگ پاکستان سدھارے کچھ اپنی ملازمتوں کے سلسلے میں کسی دوسرے شہر کے ہو رہے اور کچھ جو باقی بچے ہیں وہ اس غم کا شکار ہو کر رہ گئے کہ اب کس کے ساتھ اٹھیں بیٹھیں، کافی ہاؤس جائیں تو جانا پہچانا چہرہ کہاں سے نظر آئے، جلسہ ہو تو کہاں اور بحث کرے تو کون۔ کچھ برسوں تک یہ عبوری دور چلتا رہا۔ اس عرصہ میں مجاز میں بھی تبدیلیاں پیدا ہوئیں ان کی پریشانیوں اور الجھنوں میں بھی اضافہ ہوا۔ انھیں تنہائی کا احساس بھی ستانے لگا۔ شراب ان پر حاوی ہو گئی اور اپنوں سے بچھڑنے کے بعد جن غیروں سے انھیں رشتہ جوڑنا پڑا وہ شعر کہنے والے مجاز سے زیادہ شراب پینے والے مجاز کے دوست ثابت ہوئے۔ آخرکار اس یادگار دور کا ممتاز رکن "ہم پر ہے ختم شامِ غریبانِ لکھنؤ" کہتا ہوا اس شہر اور اس کے ادبی ہنگاموں سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا۔

اب لکھنؤ میں اردو کے لکھنے والوں کی سرگرمیاں پھر شروع ہوئی ہیں اور ایک نیا گروہ ابھر کر سامنے آ رہا ہے تو شاید اس شہر کی گزشتہ ادبی روایات سے ٹوٹے ہوئے رشتہ کو جوڑنے کے لئے ہم مجاز کو یاد کر رہے ہیں۔ یہ دراصل مجاز ہی کی یاد نہیں بلکہ اس بیتے ہوئے دور کی بھی یاد ہے جسے ایک بار پھر لوٹ کر آنا چاہیے۔ (قومی آواز)

اپ راشٹرپتی اور نائب صدر کے لفظوں پر لفظی بحث

راجیہ سبھا میں اپ راشٹرپتی اور نائب صدر کے لفظوں پر بڑا دلچسپ مباحثہ ہوا۔ مسٹر اے۔ بی۔ باجپئی (جن سنگھ) نے سوال کیا کہ جبکہ آل انڈیا ریڈیو کی اردو نشریات میں پریزیڈنٹ کو راشٹرپتی کہا جاتا ہے تو وائس پریزیڈنٹ کو نائب صدر کیوں

کہا جاتا ہے۔ اس کے جواب میں نشریات کے نائب وزیر مسٹر شیام ناتھ نے کہا کہ راشٹرپتی عام فہم ترکیب ہے جبکہ اُپ راشٹرپتی (نائب صدر) عام فہم نہیں۔ مسٹر رنجن رائے (کانگریس) نے دریافت کیا کیا نائب صدر کی ترکیب مغلیہ دور حکومت میں چھوٹے موٹے سرکاری عہدیداروں کے لئے استعمال نہیں ہوتی تھی اور کیا اس اصطلاح کے استعمال کرنے سے پہلے جانکار تاریخ دانوں سے مشورہ لے لیا گیا تھا۔ اس پر مسٹر شام ناتھ نے اعتراف کیا کہ ایسا نہیں ہوا۔ مسٹر اے۔ ڈی۔ مانی (آزاد) نے دریافت کیا کہ جب ڈاکٹر رادھا کرشنن خود اس عہدے پر فائز تھے تو ان کو اُردو نشریات میں کیا کہا جاتا تھا۔ ایک دوسرے ممبر نے مشورہ دیا کہ وائس پریزیڈنٹ اُردو کے عالم بھی ہیں اس لفظ کے متعلق خود ان کا خیال کیوں نہیں معلوم کر لیا جائے۔ اس پر ڈاکٹر ذاکر حسین نے جو اس وقت راجیہ سبھا کی چیرمینی کے فرائض انجام دے رہے تھے مزاحیہ انداز میں کہا کہ اس وقت تو میں اس پوزیشن میں نہیں کہ وائس پریزیڈنٹ کے پاس جا سکوں۔ اس پر مزید سوالوں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔

سرکاری دفتروں کے بورڈ پر اُردو میں نام لکھنے کی ہدایت

احکام کی تعمیل نہ کرنے والے دفتروں کے نام بتلانے کیلئے انجمن ترقی اُردو سے حکومت آندھرا پردیش کی خواہش

حیدرآباد۔ ۸ر دسمبر۔ حکومت آندھرا پردیش نے انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش سے خواہش کی ہے کہ ان سرکاری دفاتر کے نام بتلائے جائیں جنہوں نے سائن بورڈز پر اُردو کے استعمال کے تعلق سے حکومت کے جاری کردہ احکام کی ابھی تک تعمیل نہیں کی ہے۔ انجمن ترقی اُردو آندھرا پردیش نے حال ہی میں ریاستی حکومت کی توجہ اس واقعہ کی جانب مبذول کرائی تھی کہ سائن بورڈز پر اُردو کے استعمال کے تعلق سے اس حکومت کی جاری کردہ ہدایات کی کئی سرکاری دفاتر نے حتیٰ کہ حیدرآباد و سکندرآباد کے دفاتر نے تعمیل نہیں کی ہے اور روڈ ٹرانسپورٹ کارپوریشن کی بسیں، نیز حیدرآباد کے گرد و نواح میں واقع سنگ میل پر اُردو کا نام و نشان نہیں ہے۔ انجمن کی اس نمائندگی کے جواب میں جنرل اڈمنسٹریشن ڈپارٹمنٹ حکومت آندھرا پردیش نے مطلع کیا ہے کہ اس تعلق سے حکومتی احکام کی تعمیل کی حیدرآباد و سکندرآباد میں اور اضلاع تلنگانہ کے مستقروں پر واقع بیشتر سرکاری دفاتر سے رپورٹ موصول ہوئی ہے۔ جی اے ڈی نے انجمن سے خواہش کی ہے کہ ان محکموں کے نام بتلائے جائیں جنہوں نے زیر بحث ہدایات کی تعمیل نہیں کی ہے۔ آر ٹی سی کی بسوں کے تعلق سے انجمن کو مطلع کیا گیا ہے کہ اس کو اس تعلق سے محکمہ امور داخلہ سے براہ راست جواب وصول ہوگا۔

بقیہ: جامع الاخبار

ستمبر سنہ ۱۸۴۴ء کے پرچے میں مولوی محمد مہدی واصف[1] کے لکھے ہوئے تذکرۂ شعرا "معدن الجواہر" پر ضلع نیلور کے تحصیلدار عبدالقادر قادر میاں ہمراز کا مدحیہ قطعۂ تاریخ چھپا ہے، ملاحظہ ہو۔

جو واصف کرد تالیف کتابے   کزاں بہرہ بہ ہر یک سخن سنج
بفکر سال اتمامش دلم گفت   جواہر خانۂ سرمایۂ گنج

۱۲۶۰ھ

خبر جودھپور

مہاراجہ وہاں کا بہت خوب شخص ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس سے مہاراجہ میان سنگھ سے بہت بہتر آدمی ہے میجر لڈلو صاحب اس سرحد میں بطریق وکالت رہتے ہیں۔ خبر ہے کہ ایک عورت اوپا ادھارم نامی اس سردار کے پاس جا کر بیان کی کہ اس ملک کے سرحد میں خزانہ اور جواہر جابجا گڑھے ہوئے ہیں، اگر حکم ہو تو بتلاتی ہوں، یہ بڑی نعمت غیر مترقبہ معلوم ہوتی ہے۔ اب دیکھا چاہئے کہ میجر لڈلو صاحب کیا کرتے ہیں۔ (اکتوبر سنہ ۱۸۴۴ء)

---

[1] مولوی محمد مہدی نام فرزند محمد عارف الدین خاں رونق مدراس مولد اور سنہ ۱۲۱۲ ہجری سال ولادت ہے۔ فارسی اور عربی مدراس کے علماء و فضلا سے پڑھی انگریزی میں بھی اچھی مہارت تھی، شاعری میں اپنے والد سے اصلاح لیتے رہے۔ سنہ ۱۲۶۱ ہجری میں جب نواب غلام محمد غوث خاں بہادر اعظم نواب کرناٹک نے محفل مشاعرۂ اعظم قائم کی تو واصف اس میں داخل ہوئے اور محکمۂ عالیہ کی مترجمی بھی کرتے رہے۔

اُردو اور فارسی کی کئی کتابیں آپ کی تصنیف ہیں، ان میں ایک "تذکرۂ معدن الجواہر" بھی ہے، اس تذکرے میں بعض شعراء کے کلام پر اعتراضات کئے ہیں، ان کے تشفی بخش جوابات نواب اعظم نے تذکرۂ گلزار اعظم میں دئے ہیں۔ سنہ ۱۲۷۱ھ میں ایک اور مختصر سا تذکرہ عربی میں بنام "حدیقۃ المرام" لکھا جس میں علماء اور امراء و شعراء کے حالات درج کئے ہیں۔

سنہ ۱۲۹۰ ہجری میں بمقام حیدرآباد سفر آخرت پیش آیا۔ مرحوم کے فرزند متخلص بہ والا نے یہ تاریخ رحلت لکھی۔

مہدی واصف رجب کی تیسویں   فضل حق سے بحرِ رحمت گئے
سال رحلت ان کا والا نے کہا
آج واصف داخل جنت ہوئے

سنہ ۱۲۹۰ ہجری

(سخنوران بلند فکر مولفہ مولوی محمد منور گوہر)

مراسلات

"کیا مشاعروں اور فلمی غزلوں سے اُردو زندہ رہ سکتی ہے؟"

(فضیل الدین ہاشمی صاحب کے مراسلے شائع شدہ ۸ نومبر ۶۲ء کے سلسلے میں)

دہلی میں اگر کسی زمانے میں اُردو کے پبلشر بے شمار تھے اور نامساعد حالات کی بنا پر اب باقی نہیں رہے یا ان کی حالت بہت پتلی ہو گئی ہے تو کیا اس وجہ سے یہ حکم لگایا جا سکتا ہے کہ اُردو زبان مر رہی ہے؟ کیا کسی زبان کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کے پبلشر دہلی میں زیادہ ہوں — اُردو زبان نے اُردو کے پبلشروں کو پیدا کیا ہے نہ کہ اُردو کے پبلشروں نے اُردو کو جنم دیا ہے۔ پھر یہ کیسے تسلیم کر لیا جائے کہ اُردو زبان مر رہی ہے؟ یہی بات اُردو اخبارات و رسائل اور کتابوں کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے اگر ان کو اُردو داں حضرات خرید نہیں رہے ہیں تو ہمیں سوچنا پڑے گا کہ اس کی وجہ کیا ہے؟ کیا اُردو داں حضرات کی قوت خرید کم ہو گئی ہے یا کوئی اور وجہ ہے؟

۲۲ لاکھ دستخط سے صدر جمہوریہ ہند کو محضر نامہ پیش کیا گیا تھا۔ اگر اس پر اس وقت کے صدر، آنجہانی شری بابو راجیندر پرشاد نے ہمدردی کے ساتھ غور نہیں کیا تو کیا ہم یہ سمجھ لیں کہ موجودہ صدر جمہوریہ ہند اور مستقبل کے صدر جمہوریہ ہند بھی اس پر غور نہیں کریں گے؟ کیا ہم نے ایک بار ناکام ہونے کے بعد دوبارہ کوشش کی؟ چیونٹی بھی اناج کے دانے کو اپنی منزل تک لے جانے کے لئے بار بار کوشش کرتی ہے۔ یہ ہماری مادری زبان کا مسئلہ ہے۔ ہمیں بار بار کوشش کرنے سے کس نے منع کیا ہے؟ کیا ہم کوشش کریں تو کامیاب نہیں ہو سکتے؟ کامیاب ضرور ہو سکتے ہیں بشرطیکہ ہم اس قسم کی مایوسی کی باتیں کرنا چھوڑ دیں اور برابر اپنی کوششوں کو جاری رکھیں۔

حکومت اتر پردیش اپنے سہ لسانی فارمولے میں اگر اُردو کو شامل نہیں کر رہی ہے یا اگر جامعہ عثمانیہ میں یونیورسٹی کی زبان اُردو کے بجائے انگریزی کر دی گئی ہے تو کیا کوئی دیگر صوبائی حکومت اپنے سہ لسانی فارمولے میں اُردو کو شامل نہیں کر سکتی؟ کیا کوئی دوسری یونیورسٹی انگریزی کے بجائے اُردو کو یونیورسٹی کی زبان قرار نہیں دے سکتی؟ ہمیں ایسے امکانات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔

قریب المرگ حالت میں بھی مریض اور اُس کے تیمار دار صحتیابی کے لئے جد و جہد کرتے ہیں۔ اور اکثر ایسا دیکھا گیا ہے کہ مایوسی مبدل بہ خوشی ہو گئی ہے۔ اُردو کی حالت تو ایسی گئی گزری نہیں۔ وہ بذات خود صحت مند ہے اور روز بروز عوام سے قوت حاصل کر رہی ہے۔ پھر ہم یہ کیسے گمان کر لیں کہ اُردو زبان مر رہی ہے؟ کیا کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ اُردو زبان میں زندہ رہنے کی صلاحیت باقی نہیں رہی؟

ہمیں اس بات کا شدید احساس ہے کہ ہندوستان میں اُردو زبان کے ساتھ ظلم کیا جا رہا ہے۔ اس زبان کو مٹا دینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ حکومت اُردو زبان کے ساتھ سوتیلی ماں کا سا سلوک کر رہی ہے۔ لیکن ان سب باتوں سے اس بات پر کہاں روشنی پڑتی ہے کہ اُردو زبان پر زوال آ رہا ہے۔

دنیا میں حکومتوں کی پالیسیاں بھی بدلتی رہتی ہیں اور ملکوں کی حکومتیں بھی آئے دن بدلتی رہتی ہیں۔ پھر ہمیں یہ یقین کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ موجودہ حکومت کا سلوک اُردو زبان کے ساتھ سدا یہی ایک جیسا رہے گا۔

جموں و کشمیر — کی صوبائی زبان اُردو ہے۔ یہ بات ہمارے لئے بہت زیادہ خوشی کی نہیں ہے۔ لیکن ہم اس بات کو نظر انداز بھی تو نہیں کر سکتے۔ جب ہندوستان کے ایک صوبے میں بنگالی، تلنگی، ملیالم، گجراتی، مراٹھی وغیرہ زبانیں صوبائی زبان کی حیثیت سے زندہ رہ سکتی ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اُردو بھی زندہ نہ رہے — وہ بھی تو آخر ہندوستان کے ایک صوبے کی صوبائی زبان تسلیم کی گئی ہے۔

اُردو زبان کا شمار دُنیا کی بڑی بڑی ترقی یافتہ زبانوں میں ہوتا ہے۔ اس زبان میں دُنیا کی بہت سی زبانوں کے مقابلے میں علم و ادب کا بیش بہا ذخیرہ موجود ہے۔ اس زبان میں وہ خوبی ہے جو اس زبان کو دُنیا کی دیگر زبانوں میں ممتاز کئے ہوئے ہے۔ جب تک اس زبان کا علم و ادب زندہ ہے جب تک اس زبان میں اس کی خوبی زندہ ہے اور جب تک اس زبان میں زندہ رہنے کی صلاحیت باقی ہے تو حکومت چاہے لاکھ اس کے ساتھ سوتیلی ماں کا سا سلوک کرے اور فرقہ پرست طاقتیں چاہے لاکھ اس زبان کو مٹانے کی کوشش کریں، اس زبان کا زوال ناممکن ہے۔

اُردو زبان عوام کی زبان ہے اور جب تک عوام زندہ رہیں گے اُردو زبان بھی زندہ رہے گی۔

(اختر پرویز۔ سکریٹری انڈیا لائبریری۔ برہان پور)

امریکہ میں اُردو

(بحوالہ تنظیم میسور) کولمبیا یونیورسٹی کے شعبۂ صحافت کے پروفیسر ڈاکٹر موہن برگ نے ایک پریس کانفرنس میں جس میں بمبئی کے صحافی شامل تھے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ امریکہ میں لوگ اُردو سے واقف ہیں۔ اُنھوں نے کہا کہ بیشک اُردو کو کون نہیں جانتا۔ اور جہاں تک میرا تعلق ہے میں اُردو سیکھ رہا ہوں۔ آپ نے اُردو میں ہی گفتگو کی۔

جون پور میں شفیق مرحوم کی یاد تازہ

جونپور میں علامہ شفیق جون پوری کی یاد میں ایک شاندار پیمانے پر مشاعرہ اور کوی سمیلن ہوا۔ اس موقع پر ملک کی ممتاز شخصیتوں نے خلوص و محبت کے پیغام بھیجے۔ وزیر اعظم جواہرلال جی نے لکھا تھا کہ شفیق جون پوری ایک ممتاز اور محب وطن شاعر تھے۔ ڈاکٹر سمپورنانند نے لکھا کہ شفیق جونپوری ان ادیبوں میں سے تھے جن کے لئے میرے دل میں بڑی عزت ہے۔ کشمیر کے وزیر اعظم خواجہ شمس الدین نے لکھا کہ علامہ نے قوم و ملک اور علم و ادب کی جو شاندار خدمات انجام دی ہیں، وہ قطعی ناقابل فراموش ہیں۔

مشاعرہ اور کوی سمیلن کا افتتاح کرتے ہوئے اُتر پردیش کے وزیر داخلہ شری ہرگووند سنگھ نے کہا کہ شفیق صاحب نے جون پور کے نام کو ہندوستان کے ہر گوشے میں روشن کیا۔ اُن کی شخصیت اور فن پر نہ صرف ہمیں بلکہ سارے ملک کو بجا طور پر ناز ہے۔

مشاعرہ اور کوی سمیلن سے پہلے ہندی ادب کے ممتاز نمائندوں نے اپنی تقریروں میں شفیق جونپوری کو خراج تحسین پیش کیا۔ ملک کے مشہور و معروف شاعروں اور کویوں نے اپنے بیش بہا کلام سے سامعین کو نوازا۔

یوم صدیق حسن

لکھنؤ میں اعلیٰ پیمانے پر یوم سید صدیق حسن منانے کے سلسلے میں پنڈت آنند نراین ملّا کی صدارت میں ایک انتظامی کمیٹی کی تشکیل کی گئی جس کے کنوینر شری امین سلونوی، خازن مسٹر فرحت علی آئی، اے، ایس اور ممبران مسٹر ذوالنورین کمین کمشنر، مسٹر بہادر گوا، عمر انصاری، حسن عسکری، منظر سلیم، ڈاکٹر شجاعت علی، امیر حسن نورانی ہیں۔

"یوم صدیق حسن" بزم شعرا کے زیر اہتمام منایا جائے گا۔ جس کے بانی مرحوم سید صدیق حسن تھے۔ اُن کی خواہش تھی کہ وہ اس بزم کو اعلیٰ سطح اور معیار پر لے جائیں اور اس سے حقیقی طور پر ادب اُردو کی خدمت کی جائے۔

انجمن معراج ادب گورکھپور کا میمورنڈم

چیف منسٹر صاحبہ یو۔ پی کے گورکھپور تشریف لانے کے موقع پر بھی خواہان اردو کا جو وفد مورخہ ۲۸ر نومبر ۱۹۶۳ء کو ½۱۱ بجے دن کو ملا تھا اس میں انجمن معراج ادب گورکھپور کے سکریٹری نے بھی ایک میمورنڈم پیش کیا جس میں لکھا تھا کہ کوآپریٹیو انٹر کالج پپرائچ گورکھپور اور جے پوریا انٹر کالج آنند میں یعنی دونوں کے صرف درجہ ۹ میں بیس بیس طلبہ سے زائد ہیں اور ان دونوں اداروں میں کالیفائڈ اُردو ٹیچر بھی موجود ہیں لیکن پرنسپل صاحبان اُردو پڑھانے سے انکار کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ گورنمنٹ جوبلی انٹر کالج اور ماڈل اسکول گورکھپور میں بھی درجہ ۶ میں اُردو کے کافی طلبہ ہیں اور اُردو جاننے والے ٹیچر بھی ہیں لیکن یہاں پر بھی باوجود بار بار مطالبہ کے اُردو کا انتظام نہیں ہوا ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد سے اب تک شہر اور ضلع گورکھپور کے کسی ایک بھی پرائمری اسکول میں باوجود کافی طلبہ ہونے کے اُردو کی تعلیم کا انتظام نہیں کیا گیا۔ چار اسکولوں میں درخواست بھی دی گئی ہے۔ میمورنڈم میں مطالبہ کیا گیا کہ ان اسکولوں میں اُردو کی تعلیم کا فوراً انتظام کرایا جائے۔

اراکین وفد کے نام حسب ذیل ہیں:-

۱۔ جناب الطاف حسین، ۲۔ جناب حکیم ابوالکلام صدیقی، ۳۔ جناب مولوی سید عبدالحنان مظاہری، ۴۔ جناب بدیع الزماں اعظمی، ۵۔ جناب محمد عاصم واحدی، ۶۔ مسٹر وریوسف زئی جنرل سکریٹری انجمن معراج ادب گورکھپور۔

شاستری آسان ہندی کے خواہاں

مسٹر لال بہادر شاستری نے ناگم نگم ہندی ساہتیہ پریشد کے یوم وجدان کی تقریب کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے کہا، کہ ہندی اور قومی یک جہتی کو سب سے بڑا نقصان وہ لوگ پہنچا رہے ہیں جو سنسکرت نما ہندی کے استعمال کی حمایت کرتے ہیں۔ اُنھوں نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا کہ سرکاری کاغذات میں ادق ہندی کے استعمال کی وجہ سے میں یو۔ پی اسمبلی میں کسی بل کو صحیح طور پر پیش کرنے میں ہمیشہ قاصر رہا۔

ہندی قومی یک جہتی کے مقصد کو صرف اُسی وقت پورا کر سکتی ہے جبکہ وہ آسان ہو اور عوام اُسکو سمجھ سکیں۔

ادارۂ محوی بنگلور کے زیر اہتمام اُردو کانفرنس

ادارۂ محوی بنگلور نے یہ طے کیا ہے کہ جنوری میں ایک اُردو کانفرنس بلائی جائے جس میں بلا قید مذہب ملّت ریاست میسور کی تمام انجمنوں کے نمائندے شریک ہوں، اُردو کو اس کا جائز حق دلانے کی کوشش کی جائے۔

لہٰذا بلا تفریق مذہب و ملّت ریاست میسور کی تمام ادبی و لسانی انجمنوں سے درخواست کی گئی ہے کہ اس اہم کانفرنس میں ادارۂ محوی بنگلور کے ساتھ عملی تعاون فرمائیں۔ (جنرل سکریٹری)

سہ لسانی فارمولا

انجمن ترقی اُردو پنجاب نے سہ لسانی فارمولے کے سلسلے میں اپنی ریاستی حکومت کو ایک خط لکھا تھا جس میں کہا تھا کہ پنجاب میں اُردو بھی پڑھائی جائے۔ حکومت کے محکمہ تعلیم نے جواب میں انجمن کو لکھا ہے کہ ایسا ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ پنجاب میں پنجابی ریاستی زبان، اور ہندی مرکزی زبان کی حیثیت سے لازمی ہوں گی۔ آگے چل کر انگریزی پڑھنا پڑے گی۔ اس صورت میں اگر اس فارمولے میں اُردو کو بھی شامل کر لیا گیا تو پھر طالب علموں کو چار زبانیں پڑھنا پڑیں گی جو کہ فارمولے کی رو سے مناسب نہیں ہوگا۔

موجودہ فارمولا جو ہے اس کی رو سے واقعی کوئی چوتھی زبان شامل نہیں کی جا سکتی ہے۔ لیکن جولائی ۶۳ء سے پہلے اس کی جو شکل تھی اس میں یہ تھا کہ جن لوگوں کی مادری زبان ریاستی زبان سے مختلف ہو ان کے لئے مادری زبان بھی ریاستی زبان کی طرح لازمی ہو جائے گی، اور ان کو تین کے بجائے چار زبانیں پڑھنا پڑیں گی۔ فارمولے کی یہ شکل بھی خرابیوں سے پُر تھی اور موجودہ شکل بھی بے عیب نہیں ہے۔ موجودہ شکل کا سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ جن لوگوں کی مادری زبان ریاستی زبان سے مختلف ہو اور ہندی بھی نہ ہو ان کو یہ فارمولا اپنی مادری زبان سیکھنے کا موقع نہیں دیتا۔ اس بات کو پیش نظر رکھ کر ہم نے مشورہ دیا تھا کہ سب کے لئے تین کے بجائے چار زبانیں لازمی رکھی جائیں۔

اگر ہماری ترمیم مان لی جائے تو پنجاب میں بھی اُردو کے لئے جگہ نکل آئے گی، اور بہت سی دوسری ریاستوں میں بھی اُردو کے لئے جگہ نکل آئے گی۔ (قومی آواز)

جوانوں کے لئے ۵۰ ہزار روپے کی کتابوں کا تحفہ

نئی دہلی ۱۲ر نومبر سینٹرل لائبریری ناگپور کے لائبریرین انچارج نے اگلے علاقوں میں تعینات جوانوں کے استعمال کے لئے چالیس ہزار روپے کی مالیت کی کتابیں آج لفٹننٹ جنرل ایس. پی. پی. تھوراٹ (ریٹائرڈ) کو پیش کیں۔ یہ کتابیں عوام سے حاصل کی گئی ہیں۔ ۱۰ ہزار روپے کی کتابیں لائبریرین موصوف پہلے ہی روانہ کر چکے ہیں۔

گزشتہ ہفتہ چینی حملے کے بعد انھوں نے عوام سے اپیل کی تھی کہ وہ جوانوں کے لئے کتابیں اور رسالے دیں۔ اس اپیل کا خاطر خواہ اثر ہوا اور سال بھر متواتر کتابوں اور رسالوں کے عطیات آتے رہے۔

اس "پبلک پراجیکٹ" کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ کتابوں کی فراہمی پر کوئی رقم خرچ نہیں کی گئی ہے۔ جوانوں کے لئے اس خدمت میں ہاتھ بٹانے کی غرض سے ہر شام والنٹیر لائبریری میں جمع ہوتے ہیں اور کتابوں کا انتخاب کر کے انھیں پیک کرتے ہیں۔

بہت سی کتابوں پر نوجوانوں کے لئے محبت آمیز جذبات سے بھری ہوئی تحریریں موجود ہیں خاص کر ان کتابوں پر جو بچوں نے دی ہیں۔

یہ مہم لائبریری کے لئے بھی فائدہ مند ثابت ہوئی ہے۔ بعض اوقات کچھ نایاب کتابیں بھی عطیات میں آجاتی ہیں جو جوانوں کے لئے دلچسپ نہیں ہوتیں لیکن لائبریری کے لئے بڑی کارآمد ہوتی ہیں۔ ایسی کتابوں کے بدلے میں جوانوں کے لئے ہلکی پھلکی کتابیں بھیج دی جاتی ہیں۔

اس مہم سے جوانوں اور عوام کے درمیان ایک قریبی تعلق پیدا ہو گیا ہے۔ کہیں کہیں تو لوگوں نے اپنی ساری کتابیں جوانوں کے لئے دے دی ہیں۔ مصنفوں اور ناشروں نے بھی کافی تعداد میں اپنی کتابیں مہیا کی ہیں۔

اُردو ہماری مادری زبان ہے

انجمن ترقی اُردو لکھنؤ نے "نیا تعلیمی سال اور اُردو کی تعلیم کا مسئلہ" تمام سرکاری اور غیر سرکاری امدادی ثانوی اسکولوں میں (چھٹی جماعت سے آٹھویں جماعت تک) تین زبانیں لازمی طور پر پڑھائی جائیں گی: (۱) انگریزی (۲) ہندی (۳) ایک اور ہندوستانی زبان۔ چونکہ یہ مسئلہ تعلیمی نقطہ نظر سے بہت اہم ہے اس لئے جب آپ اپنے بچے کو اسکول میں داخل کرائیں تو مندرجہ ذیل امور کا خیال رکھیں:-

۱۔ اسکول میں آپ کے بچے کی مادری زبان اُردو لکھی جائے۔

۲۔ آپ خاص طور پر اسکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب سے لکھ کر درخواست کریں کہ آپ کے بچے کو اُردو بحیثیت تیسری زبان پڑھائی جائے اور اگر اسکول میں اُردو پڑھانے کا انتظام نہ ہو تو ہیڈ ماسٹر صاحب سے بذریعہ تحریر درخواست کریں کہ اُردو پڑھانے کا انتظام کر دیا جائے۔

۳۔ اپنے بچے کے داخلے کی اطلاع مقامی انجمن ترقی اُردو کو بھیجنے کی تکلیف گوارہ کریں اور اطلاع میں یہ بھی لکھیں کہ آیا آپ کا بچہ اسکول میں اُردو میں پڑھ سکے گا یا نہیں۔ اگر اُردو پڑھنے میں کوئی رکاوٹ دیکھیں تو اس کے متعلق بھی انجمن کو مطلع کریں تاکہ وہ آپ کی مدد کر سکے۔

پرائمری اسکولوں میں اُردو پڑھانے کی اجازت پہلے ہی سے ہے۔ آپ اپنے بچوں کو "اُردو ضرور" پڑھوائیے۔

محمد عتیق صدیقی

تبصرے

تذکرۂ ہندو شعرائے بہار

مولفہ فصیح الدین بلخی

صفحات ۱۹۸، ناپ ۲۰×۳۰/۱۶، قیمت ۳.۰۰

ملنے کا پتہ: نیشنل بک سنٹر، ڈالٹن گنج پلاموں (بہار)

فصیح الدین بلخی کا نام محتاج تعارف نہیں ہے۔ ابھی گزشتہ سال ہی وہ ہم سے جدا ہوئے ہیں۔ مرحوم کو اپنے وطن بہار سے گہرا لگاؤ تھا اس لئے قدرتی طور پر وہاں کی تاریخ سے بھی ان کو خاص شغف تھا اور اس موضوع پر وہ گہری نظر بھی رکھتے تھے۔ تاریخ مگدھ ان کی پہلی تالیف تھی، جسے انجمن ترقی اردو نے سنہ ۱۹۳۲ء میں شائع کیا تھا۔ اس کے بعد ان کی متعدد کتابیں شائع ہوئیں اور رسائل میں ان کے مضامین بھی نکلتے رہے۔

"تذکرۂ ہندو شعرائے بہار" بہار کی ادبی تاریخ سے متعلق ایک پُر از معلومات تالیف ہے، جو ۱۲۹ فارسی اور اردو گو قدیم و جدید شعراء کے حالات اور ان کے کلام کے انتخاب پر مشتمل ہے۔ کتاب کے نام کے پیش نظر یہ تعداد بہت کم معلوم ہوتی ہے جس کا احساس خود مرتب کو بھی تھا۔ چنانچہ مقدمے میں اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے انھوں نے لکھا تھا کہ "یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ ہندو شعرائے بہار کی تعداد اسی قدر ہے۔ افسوس ہے کہ تلاش و جستجو کے باوجود بہتیرے شعرا کے حالات اس قدر نہ مل سکے کہ اس تذکرے میں درج کئے جاسکیں۔"

زیر تبصرہ کتاب میں تحقیق و جستجو سے بھی کام لیا گیا ہے، اور حاصل مطالعہ کو علمی انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ اس کے نام کے ساتھ "ہندو" کا لفظ اگر نہ ہوتا تو شاید اس کی اہمیت و افادیت دونوں میں اضافہ ہو جاتا۔ لیکن آج کی "لسانی فرقہ پرستی" کے دور میں جب کہ اکثریت و اقلیت دونوں اس وبا میں یکساں مبتلا ہیں، علمی تخلیقات کے دامن کو بھی اس حدبندی کے خار زار سے سلامت نکال لے جانا ممکن نہیں رہا ہے۔ یہ صورت حال افسوسناک ہی نہیں انتہا درجہ عبرتناک بھی ہے اور اقلیت سے زیادہ اکثریت کو اس پر غور کرنا ہے۔

بنگالی ہندوؤں کی اردو خدمات

مولفہ شانتی رنجن بھٹاچاریہ

صفحات ۲۹۶، ناپ ۲۰×۳۰/۱۶، قیمت ۵.۰۰

ملنے کا پتا: شانتی رنجن بھٹاچاریہ

2/1/E اشوک نگر، ریجنٹ پارک، کلکتہ ۴۰

شانتی رنجن بھٹاچاریہ کی کتاب "بنگالی ہندوؤں کی اردو خدمات" بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ مولف کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور اردو کی ادبی دنیا سے خاصے متعارف ہیں۔ ان کی یہ نئی تالیف ایسے ۹۰ بنگالی ہندوؤں کے تذکرے پر مشتمل ہے جنہوں نے انیسویں اور بیسویں صدی میں اردو نظم و نثر کی آبیاری کی ہے۔

انیسویں صدی میں انگریزی تعلیم ہندو بنگالیوں میں عام ہو چکی تھی اور یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ انگریزی حکومت جوں جوں ملک میں پھیلتی گئی، انگریزی تعلیم یافتہ بنگالی بھی سارے ملک میں عموماً اور شمالی ہند میں خصوصاً چھاتے گئے۔ ریل کے محکمے میں تو ان کی پوری اجارہ داری تھی۔ اسپتالوں میں بھی اکثر بنگالی ہی ڈاکٹر ہوتے تھے۔ یہ سب انگریزی کے ساتھ ساتھ فارسی اور اردو سے بھی واقف ہوتے تھے۔

حال ہی میں راقم الحروف کو ایک بنگالی بزرگ "ڈاکٹر مادھب نیل مکرجی سب اسسٹنٹ سرجن شاہ پور" کا ایک طبی رسالہ "تشریح و ہدایت در بیان قواعد چیچک" ملا ہے جو سنہ ۱۸۵۴ء میں "گورنمنٹ پریس دہلی میں باہتمام معین الدین حسن" چھپا تھا۔ شری بھٹاچاریہ کی زیر تبصرہ کتاب ڈاکٹر مادھب نیل مکرجی کے ذکر سے خالی ہے۔ جن بنگالی ہندوؤں نے انیسویں صدی میں اردو کی علمی، ادبی و صحافتی خدمات انجام دی ہیں ان کی فہرست خاصی طویل ہے۔ یقین ہے کہ اس "مفید" اور دلچسپ کتاب کا دوسرا اڈیشن حجم کے اعتبار سے ضخیم تر ہوگا۔ تصاویر کے اضافے نے شری بھٹاچاریہ کی کتاب کی افادیت بڑھا دی ہے۔

دونوں زیر تبصرہ کتابوں میں ایک کمی کھٹکتی ہے، اور وہ ہے اشاریہ کی کمی۔ اس طرح کی کتابوں میں اشاریہ کا نہ ہونا بڑا ستم ہے۔ اس کمی سے کتاب کی ایک تہائی افادیت تو ختم ہو ہی جاتی ہے۔

مالک انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ، پبلشر نذیر حسن، پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوا کر مرکزی انجمن ترقی اردو علی گڑھ سے شائع کیا